حیاتِ قادر

مؤلف

عبید اللہ دُرّانی

باب نمبر ۹

دربارِ عَام

آیئے اب ہم ایک زائر کی حیثیت سے قادر نگر چلیں اور بابا قادر اولیا سے ملاقات کریں، جن کے نام نام پر یہ بستی بسائی گئی ہے۔ وہاں کیا نظر آتا ہے۔ یہ بہت کچھ اس بات پر منحصر ہے کہ ہم خود کیا ہیں اور ہمارا مدعا کیا ہے۔ ریل سے اترنے کے بعد کسی تانگے والے سے کہئے کہ بابا صاحب کے پاس لے چلو اور وہ آپ کو وجے نگرم شہر کی سڑکوں اور بازاروں سے گزارتے ہوئے شمال مشرقی طرف کوئی دو تین میل کا فاصلہ طے کر کے شہر سے باہر لے آئے گا۔ شہر کافی آباد ہے۔ سڑکوں پر بہت چہل پہل ہے اور زندگی کے کافی آثار نظر آتے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ اگر آپ کے پہلو میں حساس دل ہے تو جی چاہتا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو اس شہر سے باہر نکل جائیں۔ گو اس شہر میں دوسرے جدید شہروں کی طرح کوئی خاص سماجی عیب نہیں ہے جیسے شراب خوری، جوا، سٹہ بازی، زناکاری یا فرقہ بندی وغیرہ۔

وجے نگرم ایک پرانا شہر ہے۔ یہاں کی تہذیب پرانی ہے اور انفرادی حیثیت سے لوگوں میں اب بھی دیرینہ تہذیب باقی ہے۔ اب بھی شہریوں میں وہی فراخدلی اور رواداری نظر آتی ہے جو قدیم شرفاء کا دستور تھا جو فی زمانہ معدوم ہے مگر دلِ بینا کو یہی یقین سے کہنا پڑتا ہے کہ یہاں کی مٹی یہ کہہ رہی ہے کہ کافی عمر ہو چکی ہے، اب جگہ بدلنے کی ضرورت ہے۔ جب آپ شہر کے شمال مشرق کونے سے ہو کر نکلیں گے، جہاں کی آبادی غریب مسلمانوں کی ہے تو یہ احساس اور بھی بڑھ جائے گا۔ شہر سے باہر نکلنے کے بعد نہایت عمدہ پکی سڑک اور پہاڑوں کی طرف چڑھائی ہے اور میل ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر گھنے درختوں میں نصب کئے ہوئے سبز عَلَم دکھائی دیتے ہیں اور آپ فوراً یہ خیال کرتے ہیں کہ یہی قادر نگر ہو گا۔ ریلوے اسٹیشن سے بھی کچھ فاصلہ پر ایک پہاڑ دکھائی دیتا ہے جس کی ایک چٹان پر سفیدی کر دی گئی ہے۔ اس پہاڑ کا نام مچاکونڈا (نشانی کا پہاڑ) ہے۔ اب یہ نشانی بہت دور سے نظر آتی ہے۔ اس پہاڑ کے دامن میں قادر نگر ہے۔ یہ جگہ وہی ہے جس کے متعلق پہلے بتایا جا چکا ہے کہ یہ وہی جگہ تھی جہاں ناگ پھنی کے جھنڈ، سانپ، خوفناک درندے، ارواحِ خبیثہ اور ایک نامعلوم وحشت کی وجہ سے دن کے وقت بھی باہمت لوگ آنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ آج اس جگہ ایک چھوٹا سا گائوں قدر نگر بسا ہوا ہے۔ اس میں سڑک کے دونوں طرف کچھ پکے مکانات ہیں اور بہت سی تاڑ پان کی جھونپڑیاں ہیں۔ یہاں ایک پختہ عام مسافر خانہ بھی ہے اور ایک مسجد کی نیو بھی پڑ چکی ہے۔ انہی مکانوں میں مسافر آکر ٹھہرتے ہیں۔ اسی بستی میں چار چھ دکانیں بھی ہیں جن میں کھانے پینے کا سامان بھی ملتا ہے۔ ان مکانوں میں غریب بھی رہتے ہیں اور امیر بھی

۔ مگر سارے گاؤں کی فضا غریبانہ اور فقیرانہ معلوم ہوتی ہے۔ امیر لوگ آتے ہیں تو اس فقیروں کی بستی میں وہ بھی فقیرانہ رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔

آگے بڑھ کر سیدھے ہاتھ کو مُڑیئے تو گھنے برگد کے درختوں کی ایک قطار لگی ہوئی ہے۔ وہاں سے کوئی سو گز کے فاصلہ پر بابا صاحب کا حجرۂ مبارک نظر آتا ہے۔ درختوں کے نیچے صاف اور ہموار زمین ہے۔ جہاں پہلے بڑی بڑی چٹانیں اور غار تھے۔

جب کوئی نیا مہمان آتا ہے تو جھونپڑیوں سے عورتیں اور بچے سر نکال کر دیکھنے لگتے ہیں۔ اور خوشی ان کے چہروں سے ظاہر ہوتی ہے۔ جب آپ کسی سے پوچھیں گے کہ باباصاحب سے ملاقات کیسے ہو گی تو آپ کو ہر شخص یہ بتائے گا کہ سیدھے ہاتھ پر جو برگد کا درخت ہے اس کے نیچے اوروں کے ساتھ آپ بھی بیٹھ جایئے اور جب باباصاحب باہر تشریف لے آئیں تو قطار بنا کر ایک ایک کر سب کو زیارت ہو جائے گی۔ درخت کے نیچے اور اس کے قریب کی بڑی چٹان پر دو ڈھائی سو آدمی بیٹھے ہوئے ہیں جن میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ گویا یہ چھوٹا سا مجمع حقیقت میں دنیا والوں کی ایک نمائندہ جماعت ہوتا ہے۔ ان میں سادھو بھی ہوتے ہیں، فقیر بھی، ملک التجار بھی اور ان کی بیویاں بھی جو سونے میں لدی ہوئی ریشمی ساڑیوں میں ملبوس زمین پر پالتی مارے بیٹھی ہوتی ہیں اور اس مجمع میں ماڑواڑی بھی ہوتے ہیں اور چور بازاری کرنے والے سوداگر بھی۔ اگر ایک طرف پنڈت جی مہاراج ماتھے پر قشقہ لگائے، آسن جمائے بیٹھے ہیں، تو دوسری طرف کنگال اور بھکاری بھی ہیں، کوڑھی بھی، جذامی بھی۔ ایک طرف بوڑھا اپاہج ہے جس کے پیر سُوکھ کر بدن سے جا ملے ہیں اور اس کی بیوی اس کو کاندھے پر اُٹھا کر لاتی ہے تو دوسری طرف ایک جوان لڑکی ہے جو کپڑے پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہی ہے اور لوگ ڈر کے مارے اس سے دُور ہٹ رہے ہیں۔ اس مجمع میں ایک ریٹائرڈ جج صاحب بھی نظر آرہے ہیں۔ ایک کسی ضلع کے سول سرجن بھی، کچھ شہر کے طالب علم ہیں اور کچھ مزدور۔ کچھ طوائفیں ہیں اور کچھ دُور دُور سے آئے ہوئے لاولد جوڑے بھی۔ غرض کی دنیا میں جو کچھ بھی ہے، بھلا یا بُرا، وہ سب کچھ یہاں موجود ہے۔ مسلمان صرف خال خال ہیں۔ یعنی دو چار غریب مرد اور عورتیں جو باہر سے آئے ہیں ورنہ باقی سب دوسری قوموں کے لوگ ہیں۔

درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے پڑھے لکھے لوگ دل ہی دل میں اپنی اپنی باتیں دہراتے رہتے ہیں کہ باباصاحب سے مجھے یہ کہنا ہے، وہ کہنا ہے۔ اور جو ان پڑھ لوگ ہیں، وہ ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کرتے رہتے ہیں کہ تم کہاں سے آئے ہو اور کیسے آئے ہو؟ ابھی لوگ اپنی اپنی آپ بیتی سُنا رہے ہوتے ہیں کہ دفعتاً ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے اور شور مچتا ہے کہ آ گئے آ گئے۔ اور لوگ کھڑے ہو کر آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ خدام سب کو بیٹھ جانے کی تاکید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اطمینان سے ملاقات کیجئے، گھبرائو نہیں۔ لوگ قطار بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ خدام ان کے علیحدہ علیحدہ گروہ بنا دیتے ہے۔ مثلاً عورتوں کا الگ،

لاولد جوڑوں کا الگ اور ایک ایک جتھہ کو محفل خانے کی طرف بھیجنے لگتے ہیں جہاں پر خادم ان کو ایک ایک کر کے اندر داخل کرتا ہے۔ اکثر لوگوں کے ہاتھ میں کوئی تحفہ بھی ہوتا ہے۔ مثلاً کسی کے ہاتھ میں دو اگربتیاں ہوتی ہیں تو کسی کے ہاتھ میں دو کیلے۔ کسی کے پاس تھالی میں ایک ناریل یا آم یا کبوتروں کا دانہ یا لوٹے میں دودھ ہوتا ہے۔ اکثر لوگوں کے ہاتھ میں پھولوں کے چھوٹے اور بڑے ہار ہوتے ہیں۔ کافور کے بھی ہار ہوتے ہیں اور زردوزی کے بھی۔ غرض کہ اپنی اپنی نیت اور عقیدہ کے مطابق کچھ نہ کچھ نذرانہ ہر شخص ضرور ہی لاتا ہے۔

باباصاحب محفل خانہ کے چبوترے کے بائیں کنارے ایک ستون سے پیٹھ لگا کر پالتی مار کر قبلہ رو بیٹھ جاتے ہیں۔ آپ کے بائیں ہاتھ کی طرف ایک کٹہرا ہوتا ہے جس میں ایک ایک کر کے حاجتمند آتے ہیں۔ آپ کے دائیں طرف ذرا سامنے قول بیٹھے ہوتے ہیں اور گانے والی طوائفیں۔ محفل خانہ کا پچھلا حصہ بالکل خالی رہتا ہے۔ جب لوگ باباصاحب کے سامنے آتے ہیں تو آپ کا ہنستا اور روشن چہرہ دیکھ کر ان کے دُکھ درد دور ہو جاتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں نذر ہوتی ہے۔ ہونٹ کچھ ہلتے ہیں مگر بات منہ سے نہیں نکلتی۔ حال یہ ہوتا ہے کہ آنکھیں کھلی ہوتی ہیں، آنسو ضبط و اظہار کے بیچ میں ڈگمگاتے ہیں۔ خادم جو وہاں بیٹھا ہوتا ہے نذر لے لیتا ہے۔ اگر آپ کے ہاتھ میں ہار ہوتا ہے تو آپ سے کہتا ہے کہ گلے میں ڈال دو۔ باباصاحب پوچھتے ہیں، ''آپ کا نام۔'' آپ بھرائی ہوئی آواز میں کہتے ہیں ''وینیکٹ نرائن۔'' پھر ذرا وقفہ کے بعد ''آپ اکیلے آئے ہیں۔'' ''جی۔'' ''کہاں سے آئے ہیں؟'' ''میسور سے آیا ہوں۔'' ''کس کام کے لئے آئے ہوں؟'' ''جی آپ پر سب روشن ہے۔'' پھر ایک خفیف سکوت کے بعد خادم کو آواز دیتے ہیں اور حکم ہوتا ہے ''آپ کو محفل خانہ کے دائیں بازو میں بٹھا دو۔'' آپ بیٹھنے سے پہلے اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں کہ کہیں کوئی چٹائی تو پڑی ہوئی نہیں ہے۔ پھر یہ سوچ کر کہ فقیر کے دربار میں زمین ہی کا فرش ہوتا ہے، آپ ستھرے کپڑوں کا خیال دل سے نکال کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ادھر ایک طوائف گانا شروع کرتی ہے۔

قادر شاہ مہاتما ہیں

بڑے دھنی اور پرماتما ہیں

آپ میں ایک پھریری سی دوڑ جاتی ہے اور آپ اپنی توجہ گانے کی طف سے ہٹا کر باباصاحب کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اہلِ غرض ایک ایک کر کے آتے ہیں اور اپنا دکھڑا الف سے لے کر یے تک سناتے ہیں۔ باباصاحب نہایت اطمینان یکسوئی اور خندہ پیشانی سے ایک ایک لفظ سُنتے ہیں اور بیچ میں سوالات بھی کرتے جاتے ہیں تاکہ وہ دل کھول کر بیان کر سکیں۔ پھر ایک چھوٹی سی تھالی میں سے راکھ کی بنی ہوئی دو چار ٹکیاں اُٹھا کر دے دیتے ہیں۔ زائر تو اس طرح تین چار آدمیوں کے دُکھڑے سُننے کے بعد تھک جاتا

ہے اور اپنی توجہ پھر گانے کی طرف پھیر دیتا ہے۔ مگر اللہ رے خلق کی خدمت کا جذبہ کہ بابا صاحب صبح سے دوپہر تک اور پھر دوپہر سے شام تک اور شام سے آدھی رات تک ہر ایک کا غم سنتے ہیں اور صرف تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے حجرۂ مبارک میں جو سیدھے ہاتھ پر ہے چلے جاتے ہیں اور پھر واپس آجاتے ہیں۔

بابا صاحب اس قدر ہمدردی اور توجہ سے ایک ایک کی بات سنتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ روزانہ کی اس محنت سے اگر پتھر کا بُت بھی ہو تو تھک جائے اور آدمی کے تو بیٹھے بیٹھے پیر سُن ہو جائیں۔ پیٹھ پھٹنے لگے۔ مگر بابا صاحب کے چہرے پر تکان کا ہلکا سا اثر بھی نہیں ہوتا۔ خطاکار سے خطاکار آدمی سے بھی آپ پھول کی طرح ہنستے ہوئے باتیں کرتے ہیں۔ گویا ہر ایک انسان میں آپ دلچسپی لیتے ہیں۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ جس کو ایک بار دیکھ چکے ہیں اگر وہ دس سال بعد بھی آپ کی خدمت میں آتا ہے تو آپ اس کو دیکھتے ہی فرماتے ہیں تمہارا یہ نام ہے۔ تم فلاں سن میں فلاں روز فلاں تاریخ فلاں وقت آئے تھے اور مجھ سے تم نے یہ کہا تھا اور میں نے تم کو یہ جواب دیا تھا۔ وہ اقرار کے الفاظ اپنی زبان سے نکالتا ہے۔ جی ہاں، جی ہاں، جی ہاں۔ بظاہر تو یہ ایک زبردست دماغ کی قوی یادداشت معلوم ہوتی ہے مگر سوچئے کو سینکڑوں، ہزاروں آدمیوں کی روزانہ کی بات چیت میں ایک ایک کی بات کو یاد رکھنا اور آپ سے آپ سے آپ دہرا دینا صرف یادداشت ہے یا کچھ اور بھی۔

ایک دفعہ ایک خادم نے آپ سے اس کے متعلق پوچھا تو آپ نے ارشاد فرمایا ''سب سامنے ہوتا ہے۔'' یعنی یہ یادداشت کا کرشمہ نہیں ہے بلکہ قلبِ مومن کے آئینہ کا کمال ہے۔

آپ بیٹھے بیٹھے دنیا کے مختلف ڈرامے، غم یا خوشی کی داستانیں، بیماریوں کے صدہا پہلو، دولت کے بکھیڑوں کے ہزاروں رنگ، باہمی تعلقات کی صدہا پیچیدگیاں، غریبوں کی غربت، دولت مندوں کی اونچ نیچ۔ عالموں اور پنڈتوں کے مسائل، لاولد خاندانوں کی تمنائیں، سادھوئوں اور طالبِ حق کے مدارج اور مسائل کی طلب، روحانی، جسمانی اور اخلاقی امراض اور ان کے نسخے۔ غرض کہ آپ میں دیکھنے اور سمجھنے کا جتنا ظرف ہے اس سے بھی کہیں زیادہ آپ ایک ہی دن میں دیکھ لیں گے اور حیرت میں پڑ جائیں گے کہ یہ زندہ بُت بھی عجیب بُت ہے پتھر کی مورتی کے آگے تو ہم نے یہ تماشے ہوتے دیکھے ہیں۔ مگر یہ انسان ہے یا کچھ اور جو، ہر ایک سیدھوپ اور بارش کی طرح بلا امتیاز محبت و شفقت کا برتائو کر رہا ہے کوئی تعریف کرتا ہے تو بات ٹال دیتے ہیں کوئی جاہل لڑتا ہے اور جھگڑا کرتا ہے۔ یا آپ کے جسم کو ہلا ہلا کر جھنجھوڑ کر آپ پر غصہ ہوتا ہے۔ تو بھی آپ سوائے مسکرا دینے کے کچھ نہیں کہتے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ حاسد اور بدخواہ جان بوجھ کر لڑائی کرنے کے لئے آئے ہیں کہ جھگڑا ہو۔ لاکھ ان سے میٹھی باتیں کی جاتی ہیں مگر وہ آگ برسانے سے باز نہیں آتے۔ ان کے لئے آپ کا یہ حکم ہوتا ہے کہ انہیں کسی درخت کے نیچے بٹھا دیا جائے جب ذرا ٹھنڈے ہو

جائیں گے ان کی بات سُنی جائے گی۔ بہت سے لوگ ایسے بھی آتے ہیں۔ خصوصاً عورتیں جو درد اور دُکھ کے مارے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہیں اور تقریباً سارے مجمع کے آنسو نکل آتے ہیں۔ بابا صاحب کی آنکھوں میں کچھ نمی آجاتی ہے۔ پھر مسکراتے ہیں اور کہتے ہیں یہ جگہ رونے کی نہیں ہے۔ تم اپنے سارے غم اس زمین پر گرد کی طرح جھٹک دو۔ روتے ہوئے آئے ہو تو ہنستے ہوئے جائو۔

جب کوئی ایسا مرد یا عورت جس پر خبیث روح مسلط ہو لایا جاتا ہے تو پہلے آپ نہایت محبت سے پیش آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس شخص نے ہمارا چہرہ دیکھ لیا ہے۔ تم کہیں اور چلے جائو اور جو بار بار سمجھانے پر وہ خبیث روح نہیں مانتی تو حسبِ ضرورت سختی کرتے ہیں۔ اس وقت چہرہ پر جلال ہوتا ہے۔ ساری محفل سہمی ہوئی ہوتی ہے۔ ایک ناریل منگوا کر زمین پر توڑا جاتا ہے یا کچھ سُوکھے پتے اور شاخیں منگوا کر جلادی جاتی ہیں۔ پھر وہ شخص جس پر ناپاک روح مسلط ہوتی ہے چیخیں مار مار کر سو جاتا ہے اور جب اُٹھتا ہے تو ساری دیوانگی سے پاک ہو جاتا ہے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی وقت جوش میں آکر باباصاحب ارشاد فرماتے ہیں۔ ''بابا کی عجب شان ہے جو چیز قسمت میں نہیں ہے وہ بھی دے دیتے ہیں۔'' بظاہر یہ ایک خود ستائی معلوم ہوتی ہے مگر یہ ایک بہت بڑا پردہ ہے اور پہاڑ ہے جس کو توڑ کر چند لوگوں نے باباصاحب کا قرب حاصل کیا ہے۔ دربارِ عام میں جہاں باباصاحب لباسِ فقیری میں شہنشاہی شان سے رونق افروز ہوتے ہیں۔ فیض اور احسان کے دریا بہاتے ہیں، وہاں اپنے باطن کی ایک عورت کی عصمت سے بھی کہیں زیادہ حفاظت کرتے ہیں۔ جو طالب قرب چاہتا ہے اس کے لئے اگر ایک پردہ اُٹھتا ہے تو چار پردے اور بھی ڈال دیئے جاتے ہیں۔ شک و شبہ کے پردے۔ سادگی اور بھولے پن کے پہاڑ۔ دنیاداری کے غار۔ تدابیر اور کوششوں کے جنگل قرب کے طالب کا راستہ بڑا کٹھن ہے۔ مگر دربارِ عام میں فیض کے بارہ در کھلے ہوتے ہیں۔ اس دربار میں کسی نے نہیں کا لفظ آج تک نہیں سُنا اور نہ یہ کبھی سُنا، ''تم اپنے کرتوت کے پھل پا رہے ہو ہم کیا کریں۔'' کسی بدنصیب سے بھی کبھی یہ نہیں کہا گیا کہ تمہارا مقدر ہی خراب ہے۔ اس میں کسی کا کیا چارہ۔ ہر ایک کے لئے چاہے وہ دنیا کی سنڈاس کا طالب ہو یا علم کی پیچیدگیوں میں راہ تلاشی کر رہا ہو یا عرفان کے سمندر میں غرق ہو اور سواحل ٹٹول رہا ہو۔ بقدر ظرف عطا کیا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ظرف بھی دیا جاتا ہے اور طلب بھی۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا

ورنہ گلشن میں علاجِ تنگی داماں بھی ہے

اگرچہ آپ کو کسی شاہی دربار میں جانے کا اتفاق ہوا ہو، تو معلوم ہو گا کہ یہ آداب اور اخلاق شاہی کے خلاف ہے کہ کوئی خالی ہاتھ دربار سے واپس لوٹے۔ بادشاہ کی شرافت اور غیرت کبھی یہ گوارا نہیں کرتی کہ کوئی اس کے دروازے سے خالی چلا جائے۔

یہ دنیاوی شرافت کا تقاضا اور اخلاقی معیار ہے۔ فقیر جس کا رشتہ اس معبود سے ہوتا ہے اپنی بے نیازی کی ادائوں سے دلوں کو مسخر کرتا ہے اور جو رحمن ہے اور رحیم ہے اس کے یہاں کس بات کی کمی ہے۔ فقیر کی شان بھی کیا ہوتی ہے۔ معبود کی صفات جب تک عابد میں نہ آجائیں عبادت کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ وہ رنگ ہی کیا جو خالص خدائی رنگ سبغۃ اللہ نہ ہو۔ دنیاوی بادشاہوں کے سر تو فقیروں کے پائوں پر جھکتے ہیں۔ فقیر اپنی مسکینی اور غریبی میں بھی شہنشاہی عظمت و بلندی رکھتا ہے۔ یہ تکبر نہیں مگر کبریائی ہوتی ہے۔ وہ مالدار نہیں ہوتا مگر استغنا کی شان رکھتا ہے۔ وہ خود عشق میں جلتا رہتا ہے مگر چہرہ چاند کی طرح منور ہوتا ہے جو دوسروں کے دلوں کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ فقیر دلوں کا بادشاہ ہوتا ہے اور دلوں پر حکومت کرتا ہے۔ وہ دلوں کو بدل کر مقدر کا بھی پانسہ پلٹ دیتا ہے۔ وہ تو فنا کے لاہوتی میدان کو کبھی کا طے کر چکا ہوتا ہے۔ اس لئے فقیری میں کیسی خودی اور کیسی خود پسندی۔

یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اہلِ باطن اپنے آپ کو چھپانے کے لئے عجیب عجیب طریقے اختیار کر لیتے ہیں کوئی بہشتی بنا ہوتا ہے تو کوئی موچی۔ غرض کہ مختلف طرح کے پردوں میں چھپتے ہیں، تاکہ کسی کو یہ اندازہ بھی نہ ہو کہ یہ کس افلاک کے شہنشاہ ہیں۔ جو مجذوب ہوتے ہیں وہ یا تو گندی نالیوں میں پڑے ہوتے ہیں کہ قریب جانے سے گھن آتی ہے یا پھر پاگلوں کی طرح فحش گالیاں بکتے ہیں۔ پتھر مارتے ہیں تاکہ کوئی قریب نہ آئے۔ یہ سب پردے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی روحانی عصمت کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان پردوں کی نوعیت بھی مزاج کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ کہیں یہ پردے کثیف ہوتے ہیں اور کہیں لطیف۔ اور ہر زمانہ کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ چودھویں صدی ہے اس میں خودی کا پرچار ہے۔ نفسی نفسی ہے۔ وہ مروّتیں اُٹھ گئیں۔ وہ دلجوئی کی شمع بجھ گئی۔ یتیموں کے اوپر ہاتھ رکھنے والے اُٹھ گئے۔ غریبوں کے پیٹ اور جھونپڑیاں جھانکنے والی آنکھیں پتھرا گئیں۔ اس صدی میں ذہانت اور دماغ کی کرشمہ سازیاں روبکار ہیں۔ اس لئے اس زمانہ کا پردہ ایسا ہی ہونا چاہیے جس کو دماغ عبور نہ کر سکے اور معلم الملکوت کے چیلے دُور ہی رہیں۔

بابا صاحب دربار میں رونق افروز ہیں۔ بائیں طرف سے دنیا آرہی ہے اور جارہی ہے۔ لیکن داہنی طرف دو چار لوگ ایسے بھی بیٹھے ہیں جو کچھ اور چاہتے ہیں۔ ان میں کچھ جوان ہیں اور کچھ بوڑھے۔ جوان عشق کی ناکامی یا روزگار سے مایوس ہو کر اللہ کو ڈھونڈنے نکلے ہیں۔ بوڑھے موت کو قریب دیکھ کر اور دنیا کے اندھیرے سے گھبرا کر اللہ کو پہچاننے آئے ہیں۔ درختوں کے نیچے چند سادھو اور مہنت آسن جمائے وہیں سے ڈورے ڈال رہے ہیں۔ کچھ قلندر قریب سے نعرے لگا رہے ہیں۔ کوڑھی بھی ہیں اور اپاہج بھی۔ بے غیرت بھی اور غیرت مند بھی۔ کوئی اقرار چاہتا ہے اور کوئی خوشی۔ کوئی خودی چاہتا ہے کوئی خدا۔ سب کی آنکھیں ایک چہرے کو تک رہی ہیں اور ایک ہی شخص کو مستانہ آنکھوں میں مچلنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ وہ چہرۂ انور مہتاب کی طرح دمکتا رہتا ہے

جہاں تک دربارِ عام کا تعلق ہے، فیض عام ہے۔ ہر کسی کی رسائی ہے ہر ایک سے محبت و شفقت ہے۔ مگر طالبِ حق کو دربارِ عام کے بعد آگے بھی جانا پڑتا ہے۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بہت سے لوگ دنیاوی اغراض لے کر آتے ہیں اور انہیں اس کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ ان کے اندر کون سا جوہر چُھپا ہوا ہے۔ کچھ روز قیام کرتے ہیں اور ان کے پردے ایک ایک کر کے اُٹھتے جاتے ہیں۔ وہ دنیا اور دین دونوں لُوٹ کر لے جاتے ہیں۔ اس دربار میں کبھی بھی کسی نے یہ نہیں سُنا کہ تم یا تو دنیا لو یا دین۔ جو دنیا مانگتا ہے اس کو بھی دین و دنیا ملتی ہے اور جو صرف دین مانگتا ہے اس کو بھی دین و دنیا۔ عزلت نشینی، رسمی فقیری، بھیک مانگنا، فقیر یا سادھو کا لباس پہن کر دنیاداروں کے سامنے اپنے آپ کو اللہ والوں کی شکل میں پیش کرنے کی سخت ممانعت کرتے ہیں اور وہ راستہ دکھاتے ہیں جس میں دین اور دنیا دونوں کی بھلائی ہو۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ شریف مسلمان یا راجپوتوں کے ایسے خاندان جن میں نسلاً غریت قائم رہی ہو۔ اور اج ان کی باحیا عورتوں کے پاس تن ڈھکنے کے لئے پھٹے ہوئے کپڑے بھی نہیں، جو اپنے لاغر جسموں سے بچوں کو پیٹ بھر دودھ بھی نہیں پلا سکتیں، جن کی آنکھیں آنسوئوں سے خشک ہو چکی ہیں۔ جن کے ماتھے امیدوں کی جھلک سے محروم ہو چکے ہیں۔ اپنے سینوں میں غم کے سمندر چھپائے جب بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں اور عرض کی ہے کہ بابا جی آپ اللہ کے پیارے ہیں۔ دعا کیجئے کہ ہمارے دن پھر جائیں۔ اس وقت بابا صاحب کی آنکھیں شبنمی غلاف میں ملبوس ہو جاتی ہیں جیسے کوئی دور کی چیز دیکھ رہے ہوں۔ چہرے پر غم کا اثر ہوتا ہے۔ مگر تھوڑی دیر میں اس غم کی گرد کو صاف کر کے گلاب کے پھول کی طرح مسکراتے ہیں اور چہرہ خوشی سے دمکنے لگتا ہے۔ گلاب کی پتیاں سامنے رکھی ہوتی ہیں، اُٹھا لیتے ہیں اور بہت اونچی آواز میں جیسے فطرت کی ساری طاقتوں کو بآواز بلند سُنا رہے ہوں۔ فرماتے ہیں تم غم نہ کرو۔ تمہاری مرادیں پوری ہوں گی۔ تمہاری لڑکیوں کی شادی اچھی جگہ ہو جائے گی۔ تم اپنے لڑکوں کو تجارت میں لگائو۔ وہ بھی خوش حال رہیں گے اور تم میاں بی بی بھی فلاں کام کرو۔ یہ پھٹے کپڑے نہیں رہیں گے اور تم بھی چار کوڑی والے ہو جائو گے۔'' اس وقت ان غریبوں کے چہرے دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگتے ہیں۔ اور صدیوں کے غم جو شرافت کے تقاضوں کی وجہ سے چھپے رہتے ہیں دُھل جاتے ہیں اور ان کے اچھے دن آجاتے ہیں۔ انہیں کوئی دفینہ نہیں ملتا، نہ ہی چھپر پھاڑ کر دولت آتی ہے۔ اور دولت تو خواہ دیگوں بھری ملنے آناً فاناً ختم ہو جاتی ہے مگر جن کی قسمت جاگ جاتی ہے ان کے ہر کام بننے اور سنورنے لگتے ہیں۔ بگڑی سنورتی چلی جاتی ہے۔ اس دربار میں بہتوں کی قسمت جاگتی دیکھی گئی ہے۔

جب تک اہلِ غرض کی قطاریں گزرتی رہتی ہیں، موتی نامی دودھ جیسے سفید اور لمبے لمبے ریشمی بالوں والا ایک کتا آپ کے داہنی طرف بیٹھا رہتا ہے۔ یعنی جب تک بابا صاحب بیٹھے رہتے ہیں، بیٹھا رہتا ہے۔ جب سب لوگ چلے جاتے ہیں تو یہ کتا خود کھڑا ہو جاتا ہے۔ بابا صاحب فرماتے ہیں اچھا تجھے بھی تبرک چاہیے اور اپنی ہتھیلی پر دو چار راکھ کے ٹکڑے رکھ کر کھلا دیتے ہیں۔ خدا ہی جانے اُسے ان ٹکڑوں میں کیا مزا ملتا ہے جو بڑے شوق سے کھاتا ہے۔

اس دربار کے ختم کرنے کے بعد بابا صاحب اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھے ہوئے اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر ایک راجپوت عورت آتی ہے اور شاہ ظفر کی ایک دردناک غزل گاتی ہے۔ بابا صاحب پھر ایک گہرائی میں غرق ہو جاتے ہیں۔ وہ سلطنتیں کیا ہوئیں۔ وہ بادشاہ جو فقیروں کے دل لئے ہوئے تھے وہ کیا ہوئے۔ وہ دین جس نے فقیری اور بادشاہی ایک کر کے دکھایا تھا۔ کیا فقیروں ہی کے سینہ میں محدود ہو کر رہ جائے گا، یا کردار اور اخلاق سے دنیا میں جاہ و جلال کے ساتھ فطرت کی طاقتوں کو اپنائے گا۔ کیا یہ دنیا جو بظاہر علم کی روشنی میں باطن کی تاریکی کما رہی ہے۔ اس دین کے ذریعہ پھر سے اللہ کی طرف لوٹ جائے گی۔ کیا یہ دین انسان کو پھر سے انسان بنائے گا۔ کیا یہ دین ان دلوں میں خود پرستی کی جگہ خدا پرستی کا بیج بو دے گا۔ شاہ ظفر کے ساتھ مشرقی عروج کا چراغ گُل ہو گیا۔ کیا یہ چراغ پھر سے کبھی روشن ہو گا۔ البتہ جو ھو الظاہر اور ھو الباطن ہے جو ھو الاول اور ھو الآخر ہے اس کا بھی کبھی بول بالا ہو گا۔ کیا کبھی اس دنیا میں قوموں کے علم نصب ہونے کی جگہ حق کے علم بھی نصب ہوں گے۔ معلوم نہیں ان آنکھوں کے سامنے جو شبنمی پردہ ہے اس کے پس پردہ کیا کیا خیالات ہیں، اور کیسے کیسے ولولے۔

جب آپ حجرہ مبارک میں تشریف لے جاتے ہیں تو چارپائی پر ساکت لیٹ جاتے ہیں۔ انداز یہ ہوتا ہے کہ دونوں ہاتھ سر پر باندھے ہوتے ہیں اور کوئی خادم پنکھا جھل رہا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اُس خادم کو بھی باہر کر کے دروازہ بند کر دیا جاتا ہے پھر آدھ گھنٹہ پون گھنٹہ دربار میں خاموشی رہتی ہے۔ اس کے بعد کوئی قوال کچھ عشقیہ چیز گا کر اس سکوت میں عجیب کیف پیدا کرتا ہے۔ دروازہ کھلتا ہے، بابا صاحب بالکل تر و تازہ جیسے کوئی تھکن ہی نہ ہو مسکراتے ہوئے باہر آتے ہیں اور محفل خانہ سے متصل پیچھے کی جانب جو دو کمرے ہیں اس سمت کسی خادم کے ہاتھ کا سہارا لے کر نہایت پھرتی سے چلے جاتے ہیں۔

جو تیرے عشق میں خراب ہوئے — وہ بہر حال کامیاب ہوئے

دن کو چمکے تو آفتاب ہوئے — رات آئی تو ماہ تاب ہوئے

چاند تاروں میں ضو ان ہی کی ہے — اپنے جلووں میں خود حجاب ہوئے

میکدہ اُن کے دم سے قائم ہوئے　　جام مینا بنے شراب ہوئے

ذکر میں ہے تڑپ کلی کی طرح　　فکر میں کھل گئے گلاب ہوئے

باغِ ہستی میں جب بہار آئی　　بوئے گل بن کے بے نقاب ہوئے

عقل کے سامنے رہے خاموش　　دار پر حرف لاجواب ہوئے

عرش بالائے عرش ہیں یہ لوگ　　طور پر آئے شعلہ تاب ہوئے

جو گھڑی اُن کی یاد میں گزری　　اُس گھڑی لطف بے حساب ہوئے

☆...☆...☆